Gohar e tehqeeq گوہر تحقیق
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاول پور
Year 2025; Vol 04 (Issue 02)
P. 22-40 https://journals.gscwu.edu.pk/

مزمل امین

ریسرچ اسکالر، پی ایچ۔ڈی، شعبہ اقبال اسٹڈیز، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور

ڈاکٹر محمد اصغر سیال

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اقبال اسٹڈیز، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور

Muzammil Ameen
Research Scholar, PhD, Department of Iqbal Studies, Faculty of Arts, The Islamia University of Bahawalpur, Bahawalpur, Punjab, Pakistan

Dr. Muhammad Asghar Sial
Assistant Professor, Department of Iqbal Studies, Faculty of Arts, The Islamia University of Bahawalpur, Bahawalpur, Punjab, Pakistan

علامہ اقبال اور قانون سازی

Allama Iqbal and Legislation

Abstract:

This article provides a comprehensive analysis of Allama Muhammad Iqbal's contribution to legal thought and legislative by situating his scholarly development within his educational, expert, and legislative experiences. Iqbal's formal legal education in Europe particularly his bar at law qualification from Lincoln's Inn played a formative role in shaping his understanding of constitutionalism, legal modernity, and the dynamics of state authority. His twenty six years of legal practice in British India offered him a unique vantage point from which to critically assess the colonial judicial framework and its implications for Muslim socio-political identity. Iqbal's service as a member of the Punjab Legislative Council reflects his direct engagement with institutional lawmaking. His participation in legislative debates and his advocacy for educational, social, and communal reforms demonstrate his commitment to ethical, inclusive, and progressive policymaking. Central to this study is an analysis of his sixth lecture, "The Principle of Movement in the Structure of Islam," in which

Iqbal presents a modernist and dynamic theory of Ijtihad. He argues for the reinterpretation of Islamic jurisprudence in light of contemporary realities and emphasizes the role of representative legislative bodies in ensuring a democratic and evolving legal order. By synthesizing Iqbal's European legal training, extensive professional practice, legislative involvement, and modernist jurisprudential philosophy, this article highlights his enduring relevance to contemporary debates on legal reform, constitutional thought, and Islamic legal renewal in the modern world.

Keywords: Allama Iqbal, Lawmaking, Islamic Legal Reform, Ijtihad, The Principle of Movement in the Structure of Islam, Punjab Legislative Council, Bar-at-Law, Legal Modernity, Jurisprudence, Constitutional Thought.

علامہ محمد اقبال (1877-1938) بیسویں صدی کے ایک مشہور ہمہ جہت شخصیت تھے۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا موازنہ کرتے ہوئے کسی ایک پہلو کو دوسرے پہلو پر ترجیح نہیں دی جاسکتی کیونکہ ان کی زندگی اور شخصیت کو جس پہلو سے بھی دیکھا جائے وہی اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال عالمی شہرت کے حامل ایسے شاعر تھے جنھوں نے اپنے فلسفہ میں بھی عالمی شہرت حاصل کی۔ کوئی بھی ان کے مفکرِ اسلام ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔ صاحبانِ علم نے اقبال کی شاعری کو سرچشمہ قرآن قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص بیک وقت انشاء پرداز، مصلح، معلم، فلسفی، ادیب اور شاعر ہے تو وہ حکیم الامت علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔

علامہ محمد اقبال ایک عظیم مفکر، شاعر، فلسفی کی حیثیت تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک جدید اسلامی قانونی فکر کے معمار، ماہر قانون اور عملی سیاست دان بھی تھے۔ 1897ء میں علامہ اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان اعلیٰ درجے کے ساتھ پاس کیا پھر اسی کالج میں ایم اے فلسہ میں داخلہ لیا۔ انھوں نے کچھ عرصہ اسی کالج میں بطور پروفیسر ملازمت کی اور بالآخر علامہ اقبال 25 دسمبر 1905ء کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔

جون 1907ء میں اقبال نے بی۔ اے "کیمبرج یونیورسٹی" سے، جولائی 1907ء میں پی ایچ ڈی "میونخ یونیورسٹی" سے اور جولائی 1908ء میں بیرسٹر ایٹ لاء کی ڈگری لندن کے معروف ادارے "لنکز اِن" سے حاصل کی۔ اکتوبر 1908ء میں اقبال نے لاہور ہائی کورٹ (چیف آف کورٹ) میں بطور وکیل اپنا نام رجسٹر کروایا اور 26 سال یعنی 1934ء تک بطور وکیل کام کیا۔ اس 26 سالہ عرصہ کے دوران میں انھوں نے سرکاری ملازمت کے ایک سے زائد پرکشش مواقع پر اس آزاد پیشے کو ترجیح دیتے ہوئے وکالت کو ہی ذریعہ معاش بنایا۔ اقبال آغاز وکالت میں چار سال تک اس وقت کے سب سے معتبر قانونی رسالے "انڈین کیسز" کی مجلسِ ادارت میں بطور واحد مسلمان مدیر شریک رہے۔

1908ء میں علامہ اقبال نے جب بطور وکیل وکالت کے میدان میں قدم رکھا تب عدالت عالیہ کی بار میں تاج الدین، جسٹس شہاب الدین، سر میاں فضل حسین، سر میاں محمد شفیع، جسٹس شادی لال، لالہ لاجپت رائے، پنڈت شیونارائن شمیم اور بیرسٹر جلال الدین جیسے ستارے جگمگا رہے تھے۔ اقبال بہت بڑے قانون دان تھے مگر ہندو تعصب کا شکار ہو گئے۔ ان کے بطور قانون دان نمایاں ہونے کی راہ میں اس وقت کے چیف کورٹ کے چیف جسٹس شادی لال سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔

بیرسٹر علامہ اقبال کی وکیلانہ قابلیت کی برتری کا یہ ثبوت ہے کہ انھوں نے جتنے بھی مقدمات کی پیروی کی پچاس فی صد سے زیادہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور یہ کامیابی انھوں نے اپنے وقت کے نامی گرامی وکلا کے مقابلے میں حاصل کی۔ ان قانون دانوں میں بدرالدین قریشی، بیرسٹر سر محمد شفیع، سید محسن شاہ، مسٹر محمد دین، بیرسٹر خواجہ ضیاء الدین، گوکل چند، مسٹر گن پت رائے، عزیز احمد، بھگت ایشور داس، سر فضل حسین، برج لال، شیخ عمر بخش، کنور نارائن، فقیر چند، لالہ کشن چند، رائے بہادر لالہ کپور نند لال، بلونت رائے، موتی ساگر، سردار تیجا سنگھ، رام بھاج دتہ، کالندہ رام اور دیگر بہت سے بڑے نام ہیں۔

علامہ اقبال کے دستیاب مقدمات کے ریکارڈ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بطور وکیل ان کا نام ہندوستان کے ایک وسیع علاقے میں معتبر گردانا جاتا تھا اور دور دراز اضلاع کے مؤکلین اپنے بڑے مقدمات کی پیروی کے لیے اقبال کو وکیل منتخب کرتے تھے۔ دستیاب ریکارڈ کے مطابق کیمبل پور (اٹک)، گجرات، لائل پور (فیصل آباد)، فیروز پور، سرگودھا، حصار، گورداس پور، فیروز پور، اٹک، امبالہ، منٹگمری (ساہیوال)، دہلی، گوجرانولہ، مظفر گڑھ، شاہ پور، لدھیانہ، جالندھر، کانگڑہ اور جہلم جیسے اضلاع کے علاوہ کرنالہ اور جموں و کشمیر جیسی ریاستوں کے مؤکلین شامل ہیں۔

سر میاں محمد شفیق کا لاہور میں وکالت اور قانون میں بڑا نام تھا۔ میاں محمد شفیع اور اقبال کے گہرے مراسم تھے۔ سر شادی لال کو چیف جسٹس بنانے کی وائسرائے ہند سے سفارش بھی میاں محمد شفیع نے کی تھی۔ چیف جسٹس بننے کے بعد سر میاں محمد شفیع اور سر شادی لال کہ مراسم برقرار نہ رہ سکے۔ سر شادی لال بیرسٹر اقبال کو میاں محمد شفیع کی مخالفت پر لانے کے لیے کمر بستہ رہے مگر اقبال ان کی باتوں میں نہ آئے بلکہ ان کی سازشوں کا حصہ بننے سے بھی انکار کر دیا۔

شادی لال نے اقبال کو کہا کہ میں آپ کے لیے "خان صاحب" کے خطاب کی سفارش کرنا چاہتا ہوں مگر اقبال نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ علامہ اقبال نے شادی لال کی طرف سے دیے جانے والے خطاب کو تو قبول نہ کیا تاہم وائسرائے ہند نے ان

کی علمی اور ادبی خدمات کے صلے میں یکم جنوری 1923ء کو "سر" کا خطاب ضرور دے دیا۔ "خان صاحب" سے کہیں برتر یعنی "سر" کا خطاب جو خود چیف جسٹس شادی لال کو حاصل تھا۔ اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کو اس خطاب کے پس منظر میں 24 جنوری 1923ء کو اپنے خط میں تحریر کیا:

> "سرکار نے میرے خطاب کے متعلق جو کچھ سنا ہے، صحیح ہے۔ یہ "اسرار خودی" کا انگریزی ترجمہ ہونے اور اس پر یورپ اور امریکہ میں متعدد ریویو چھپنے کا نتیجہ ہے"(1)

دیگر بھی ایسے کئی واقعات ہیں جو شادی لال کی اقبال سے عناد اور کدورت کا سبب بنے۔ اقبال کے حاسد حکام اعلیٰ کو اقبال سے بد ظن کرنے میں ہمیشہ مصروف رہے لیکن نواب ذوالفقار علی خان ان تمام فتنہ انگیزوں کے سد باب کے لئے سینہ سپر رہا کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے بیرسٹر اقبال عدالت عالیہ کے جج بن جائیں۔ 1925ء میں لاہور ہائی کورٹ میں خالی آسامی کے لیے اقبال کی بطور جج تعیناتی کی تحریک ہوئی۔ "زمیندار" اخبار میں اس بارے یوں درج ہے کہ :

> "صوبے بھر کے وکیلوں، تعلیم یافتہ لوگوں، انجمنوں اور مسلم اخباروں نے مطالبہ کیا کہ اقبال کو ان کی روشن دماغی اور قابلیت کی بنا پر عدالت عالیہ کا جج مقرر کیا جائے"(2)

شادی لال جن کا حسد اور بغض واضح طور پر اقبال کے لیے نظر آتا ہے۔ انھوں نے اقبال کو سرے سے قانون دان ماننے سے انکار کر دیا۔ فقیر سید وحید الدین نے "روز گار فقیر" میں شادی لال کے بارے لکھا ہے:

> "مگر شادی لال نے ان کے متعلق یعنی ریمارکس دیے کہ ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، قانون دان کی حیثیت سے نہیں۔"(3)

سر شادی لال کی خواہش کے مطابق اقبال جج نہ بن سکے اور آسامی کو پر کرنے کے لیے یو۔ پی سے سید آغا حیدر کا تقرر عمل میں آیا۔ جسٹس شادی لال کا یہ کہنا کہ وہ اقبال نام کے کسی وکیل کو جانتے ہی نہیں قانونی کتب میں ہائی کورٹ کے شائع شدہ فیصلہ جات کے ریکارڈ سے بھی واضح طور پر جھوٹ ثابت ہوتا ہے کیونکہ عدالت عالیہ کے شائع شدہ فیصلہ جات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شادی لال بطور مخالف وکیل اقبال کے ساتھ ہائی کورٹ کے مقدمات میں پیش ہوئے اور پھر شادی لال کے جج بن جانے کے بعد پندرہ (15) ایسے مقدمات کی تفصیل ملتی ہے جس میں بیرسٹر محمد اقبال نے جسٹس شادی لال کی عدالت میں پیش ہو کر ان مقدمات کی پیروی کی۔

حقائق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جسٹس سر شادی لال نے اقبال کے قانونی حیثیت سے نا آشنائی کی بات ذاتی ناپسندیدگی، حسد اور بدنیتی کی بناپر کی تھی کیونکہ بیرسٹر محمد شفیع کے مقابلے میں اقبال نے سر شادی لال کا ساتھ دینے سے انکار کیا تھا۔ سر شادی لال ایک طرف بحیثیت چیف جسٹس لاہور بار کے ممتاز رکن بیرسٹر اقبال کو بلا کر خود انھیں "خان صاحب" کے خطاب کی پیشکش کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان کی قانونی شناخت تک سے انکار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اکتوبر 1933ء میں جب چیف کورٹ لاہور کو ہائی کورٹ پنجاب میں تبدیل کیا گیا تو وائسرائے ہند نئے ہائی کورٹ پنجاب کا افتتاح کرنے کے لیے بطور خاص مہمان لاہور آئے۔ اس موقع پر چیف جسٹس سر شادی لال نے استقبالیہ تقریر بھی کی۔ وائسرائے ہند نے جوابی تقریر میں دیگر باتوں کے علاوہ بیرسٹر اقبال کے بارے میں بھی تعریفی کلمات کہے۔

اکثریت علامہ اقبال کی شاعری، افہام و تفہیم، فکر و فلسفہ اور عظمتوں کی معترف ہونے کے باوجود ان کی زندگی کے وکالت کے پہلو کا علم نہیں رکھتے۔ اقبال کے بارے آج تک اکثریت نے جو کچھ بھی لکھا ان کی شاعری، افہام و تفہیم اور فکر و فلسفہ کی ترویج پر لکھا ہے اور اس سب لکھے جانے کے بعد جو ایک عمومی تاثر بنتا ہے وہ یہی ہے کہ اقبال انتہائی تعلیم یافتہ، اعلیٰ پایہ کے شاعر، فلسفی اور نابغہ روزگار تھے۔ اقبال نہ صرف ہمہ وقت مسلمانان ہند بلکہ تمام مسلمان عالم کی زبوں حالی پر کڑھتے رہتے بلکہ ان کی ترقی اور عظمتوں کے بارے میں سوچتے رہتے۔ انھوں نے اپنی اس سوچ کا اظہار اپنی شاعری، فکر و فلسفہ، تقاریر اور خطبات کے ذریعے کیا۔

حقیقت تو یہ ہے اقبال کی شاعری اور فکر و فلسفہ اس قدر ہمہ گیر، ہمہ پہلو، متنوع اور جامع ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے کسی ایک پہلو کا مطالعہ اور اس پر غور و فکر شروع کر دے تو اس کو کسی اور پہلو کی طرف دھیان دینے کی فرصت نہیں ملتی۔ وہ اس موضوع کی گہرائیوں میں اس قدر مگن ہو جاتا ہے کہ باہر نہیں نکل پاتا اور اقبال کی وکالت کے پہلو کو بھول بیٹھتا ہے۔

شاعر، ادیب اور دانشور کسی بھی معاشرے کی آنکھ اور کان ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں ان تجربات و مشاہدات کو اپنی تخلیق کا حصہ بناتے ہیں، معاشرے کی نبض پر گویا ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ان اہل علم و ادب دانشوروں کا کردار لوگوں میں سیاسی، ادبی اور علمی شعور بیدار کرنے اور ان کی ذہنی آبیاری کے لیے اہم گردانا جاتا ہے لیکن جب اسی معاشرے میں ظلم و ستم، بے حسی، ناانصافی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے علاوہ فتنہ فساد عام ہو جائے تو یہ اہل علم و ادب دانشور طبقہ ادبی میدان سے باہر نکل کر سیاسی میدان میں بھی قسمت آزمائی کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بھی ہمیں کہیں نہ کہیں چند شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کے نام دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے قیام پاکستان کے دنوں سے لے کر استحکام پاکستان کی تحریکوں میں لازوال کردار ادا کیا۔ پاکستان میں ہونے والے کئی قومی انتخابات میں بھی دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے باقاعدہ طور پر بطور امیدوار حصہ لے کر اپنی سماجی اور سیاسی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہونے کا ہنر آزمایا۔ پاکستان کے قومی شاعر علامہ محمد اقبال نے جہاں امت مسلمہ کو بیدار کرنے کے لیے اپنی شاعری کا سہارا لیا وہاں سیاست کے میدان میں بھی حصہ لیا۔ قیام پاکستان سے قبل ڈاکٹر علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور یوں ان کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔

20 جولائی 1926ء کو علامہ اقبال نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات میں حصہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کے دوستوں کے علاوہ اسلامیہ کالج لاہور کے اساتذہ اور طلباء نے ان کی انتخابی مہم بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہر طرف چلانا شروع کی 23 نومبر 1926ء کو علامہ اقبال مجلس قانون ساز پنجاب کے رکن کی حیثیت سے 5675 ووٹ لے کر کامیاب قرار پائے جبکہ ان کے مدمقابل ملک دین محمد نے 2478 ووٹ حاصل کیے۔ 26 دسمبر 1926ء کو پنجاب قانون ساز اسمبلی کے الیکشن میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی بطور پنجاب لیجسلیٹو کونسل ممبر کی جیت کا باقاعدہ اعلان کیا گیا۔ وہ اس قانون ساز اسمبلی سے 23 نومبر 1926ء سے 23 نومبر 1929ء تک وابستہ رہے۔

علامہ اقبال نے اسلامی فکر کو شاعری کے ڈھانچے میں ڈھال کر پیش کیا اور امت مسلمہ کو خواب غفلت سے جگانے کی بھرپور کوششیں کیں۔ ان کی شاعری میں محض جذباتی یا ادبی اظہار نہیں ملتا بلکہ ایک فکری منشور ملتا ہے جس کا مقصد فرد و ملت کی اصلاح اور اسلامی نظام کو بحال کرنا اور مسلمانوں کو عظیم مقام تک لے جانا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری میں فلسفہ، تصوف، تعلیم، سیاست، معیشت اور قانون سازی جیسے اہم موضوعات پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔

کسی بھی قوم کی تہذیب و تمدن اور فکری سطح کا عکاس ہمیشہ قانون ہی ہوتا ہے۔ ہمیشہ وہی قوم ترقی کرتی ہے جس قوم کا قانون اس کی دینی و اخلاقی بنیادوں سے بھی ہم آہنگ ہو۔ علامہ محمد اقبال کے نزدیک اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے جو صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور قانونی زندگی کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ اسی لیے ایک اسلامی ریاست کے قانون سازی کا انحصار ہمیشہ قرآن و سنت اور اتحاد پر ہی ہونا چاہیے۔

علامہ محمد اقبال نے قانون کو کبھی بھی جامد تصور نہیں کیا بلکہ اسے حالات اور وقت کے مطابق اجتہاد کے ذریعے تازہ رکھنے کے قائل تھے۔ ان کے ہاں "اجتہاد" ایک مسلسل جاری رہنے والا ایسا عمل ہے جس کے ذریعے امت مسلمہ ہر وقت بدلتے ہوئے حالات کے مطابق قرآن وسنت کی روشنی میں نئے قوانین وضع کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مغربی قانونی نظام پر شدید تنقید کی جو ایسے قوانین قائم کرتا ہے جو انسانوں کو محض مادی مخلوق تصور کرتے ہیں۔

اقبال کے مطابق قانون کی بنیاد "اخلاقیات" اور "روحانیت" پر ہونی چاہیے ایسا قانون جو خودی کی پرورش کرے فرد کی عزت کرے اور قوم کو متحد کرے. انھوں نے اپنی شاعری میں اسلامی قانون کو ایک زندہ اور مؤثر نظام قرار دیا جو نہ صرف فرد کی اصلاح کرتا ہے بلکہ اجتماعی نظام کی بھی اصلاح کرتا ہے۔

علامہ اقبال کا پیش کردہ قانون سازی کا تصور اسلامی فکر پر ہی صرف مبنی نہیں ہے بلکہ موجودہ دور کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی بھی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اقبال کا خیال تھا کہ قانون محض نظم وضبط کا ایک اعلی کار نہیں بلکہ ایک فکری اور روحانی نظام ہے جو انسان کو زندگی کے حقیقی مقصد سے جوڑتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھرپور زور دیا کہ قانون کی بنیاد مغربی مفادات یا مادہ پرستانہ خواہشات پر ہونے کے بجائے وحی الٰہی یعنی قرآن وسنت اور اجتہاد پر مبنی ہونا چاہیے۔

علامہ محمد اقبال کی فکر میں اجتہاد کو بنیادی مقام حاصل ہے ان کے خیال میں بدلتے ہوئے سائنسی، معاشی اور سماجی حالات کے مطابق اجتہاد ایک ایسا منظم طریقہ ہے جو اسلامی قانون کو تاحیات زندہ رکھتا ہے وہ اسلامی فقہ کو جامد ماننے کے بالکل بھی قائل نہیں ہیں بلکہ اسے ہمیشہ متحرک اور مسلسل ارتقاء پذیر سمجھتے تھے انھوں نے عدالت، معیشت، عورتوں کے حقوق، خلافت، تعلیم اور بین الاقوامی تعلقات جیسے موضوعات پر بھی اجتہاد کی ضروریات پر بھرپور زور دیا۔

علامہ اقبال کے خطبات میں اجتہاد اور اسلامی قوانین کا موضوع نہ صرف معاشرتی پہلوؤں کے لحاظ سے اہم ہے بلکہ فکری لحاظ سے بھی انتہائی معنی خیز ہے۔ اقبال کے نزدیک شریعت ایک لچکدار اور زندہ ضابطہ حیات ہے جو حالات اور وقت کے مطابق رہنمائی فراہم کرتا ہے، نہ کہ محض ایک رسمی احکام کا مجموعہ یا قدیم قانونی مجموعہ۔ اقبال کے خطبات میں یہ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اسلامی قوانین کی اصل روح اجتہاد میں پوشیدہ ہے اور یہ قوانین اخلاق، حکمت اور عقل کے اصولوں سے جڑے ہیں۔

اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شریعت کی حقیقی مقاصد روحانی ترقی، مساوات، عدل اور انسانی فلاح ہیں۔ اجتہاد کے بارے میں ''تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'' میں اقبال فرماتے ہیں:

" اسلامی قوانین کا پہلا ماخذ قرآن حکیم ہے۔ اس میں تفصیلی قوانین کی جگہ اصول وکلیات زیادہ ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے انسانی فکر کے لیے پوری گنجائش رکھی ہے۔ چنانچہ مسلم فقہانے ان اصولوں کی بنیاد پر ایک نظام قانون وضع کیا جو قدر وقیمت کے لحاظ سے کسی طرح بھی رومی قانون سے کم نہیں بلکہ فائق ہے، لیکن یہ بہر حال انسانی تشریحات ہیں، اس لیے ہم اس کو حرف آخر نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اگر عہد حاضر کے مسلمان قرآن مجید کے اصولوں کی روشنی میں اسلامی نظام کی نئی تشریح کریں تو وہ کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے، اور اس عمل پر متقدمین کے کام اور ان کی آرا کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔ "(4)

اجتہاد فقہی مسائل پر جدید حالات کے مطابق تحقیق و استدلال ہے۔ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی عملی اور فکری بیداری کا بنیادی ذریعہ اجتہاد ہی ہے۔ اجتہاد بدلتے حالات کے مطابق حل تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو معاشرہ اور فرد دونوں کی زندگیوں میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اقبال اپنے خطبات میں اجتہاد کی ضرورت کو اس بنیاد پر واضح کرتے ہیں کہ مسلمان اقتصادی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لیے صرف قدیم قوانین پر انحصار نہیں کر سکتے بلکہ انھیں اپنے بدلتے حالات کے مطابق قوانین کو سمجھنا اور نافذ کرنا ہو گا۔ شاید الطاف احمد اعظمی نے اس لیے لکھا ہے کہ:

''قیاسی احکام حالات اور ظروف زمانہ کے تابع ہیں اور ان کی تبدیلی سے وہ بھی تبدیل ہو جائیں گے یا یوں کہہ لیں کہ اُن کی اطلاقی صورتیں بدل جائیں گی۔ اس سلسلے میں حنفی فقہا کا رویہ ماضی کی طرح آج بھی قابل اعتراض ہے۔ انھوں نے حنفی فقہ کو، جو زیادہ تر قیاسی اور استدلالی احکام پر مشتمل ہے، ناقابل تغیر سمجھ لیا ہے۔ ''(5)

اقبال کے خطبات میں یہ بات نمایاں ملتی ہے کہ اجتہاد اور شریعت ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں۔ شریعت کے اصول اجتہاد کے ذریعے زندہ رہتے ہیں اور مسلمانوں کی عملی اور فکری زندگی میں مؤثر رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ اجتہاد کی قوت کے بغیر مسلم معاشرہ عملی اور فکری طور پر جمود کا شکار ہو جائے گا جبکہ اجتہاد کے ذریعے قوانین کی روح کو سمجھ کر انھیں عملی زندگی میں نافذ کرنے والا معاشرہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہو گا۔ اقبال کے نزدیک جو قوم اجتہاد سے دور ہو جاتی ہے وہ نہ صرف

علمی اور عملی لحاظ سے بلکہ روحانی اور اخلاقی طور پر بھی کمزور ہو جاتی ہے اور جو قوم اجتہاد کے ذریعے شریعت کی روح کو سمجھ کر عمل کرتی ہے وہ فکری، روحانی، اخلاقی اور علمی ترقی حاصل کرتی ہے۔

علامہ اقبال نے خطبہ اجتہاد دیتے وقت ترکی کی جدیدیت کو بھی سامنے رکھا تھا۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل میں ترکی اپنے آپ کو اندھی تقلید سے آزاد کرنے کے لیے کوششیں کر رہا تھا۔ اقبال نے ترکی کی اس کاوش کو غور سے دیکھا کیونکہ اقبال کے مطابق مرد مومن اس وقت تک اپنی خودی کو مستحکم نہیں کر سکتا جب تک اس میں جذبۂ حریت موجود نہ ہو اور وہ روایات کے شکنجوں کو توڑ نہ دے۔ ترکی اس وقت بلاشبہ اندھی تقلید کے ان بت کدوں کو پاش پاش کر رہا تھا۔ ترکوں کے اس اقدام کے بارے اقبال یوں رقمطراز ہیں:

> ”دراصل یہ صرف ترک ہیں جو امم اسلامیہ میں قدامت پرستی کے خواب سے بیدار ہو کر شعور ذات کی نعمت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ صرف ترک ہیں جنہوں نے ذہنی آزادی کا حق طلب کیا ہے اور جو ایک خیالی دنیا سے نکل کر اب عالم حقیقت میں آ گئے ہیں۔“(6)

اقبال اسلامی قوانین کی تشریح میں ان مقاصد پر زور دیتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ شریعت محض رسمی عبادات یا اطاعت کی تکمیل نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی فلاح، مساوات، انصاف اور روحانی ترقی ہے۔ اقبال کے نزدیک اس سلسلے میں اجتہاد ایک ایسا ذریعہ ہے جو قوانین کی روح کو سمجھ کر انھیں عملی زندگی میں نافذ کرنے کی قوت دیتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اجتہاد محض فقہی مسئلہ نہیں بلکہ ایک عملی اور فکری ضرورت ہے جو فرد اور معاشرہ دونوں کی ترقی کے لیے لازم ہے۔

اقبال کے نزدیک اجتہاد اور شریعت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جو مسلمان ان دونوں کو سمجھ کر عمل کرتا ہے وہ نہ صرف اپنی زندگی کو بہتر بناتا ہے بلکہ اپنے معاشرے کی اصلاح اور ترقی میں بھی مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اجتہاد اور اسلامی قوانین کا مطالعہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے معاشرتی، عملی اور فکری ترقی کا ذریعہ ہے بلکہ اجتہاد عملی اصلاح، علمی ارتقا اور فکری بیداری فراہم کرتا ہے اور شریعت کے اصولوں کو حالات اور وقت کے مطابق نافذ کرنے کی راہ بھی ہموار کرتا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک قدامت پسندی اور روایت پرستی ہی امت مسلمہ کے زوال کا سبب تھی۔ اقبال کا خطبہ اجتہاد محض ترکی کی جدیدیت کی ہی نقالی نہیں کرتا بلکہ انھوں نے ترکی کے مشہور شاعر ضیا سے جس کا حوالہ بار بار خطبہ اجتہاد میں اقبال نے کیا ہے جہاں ضروری تھا اختلاف بھی کیا ہے۔ اقبال اپنے خطبہ میں اس اجتہاد کے حق میں نظر آتے ہیں جس میں اسلامی روح سرائیت کر چکی ہو اور ترکی اس وقت کے "لا" کے صنم کدوں کو تو توڑ چکا تھا مگر "الا" کے معبد ابھی تک تعمیر نہ کر سکا تھا۔ اس بارے اقبال اپنے خدشے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے۔ آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے، لہٰذا نسلیّت اور قومیت کے یہی تصورات جو اس وقت دنیائے اسلام میں کارفرما ہیں، اس وسیع مطمح نظر کی نفی بھی کر سکتے ہیں جس کی اسلام نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے۔''(7)

علامہ اقبال کے خطبات اجتہاد کے حوالے سے ایک گہرے فکری تجزیہ کی حیثیت رکھتے ہیں انھوں نے اجتہاد کو اسلامی فکر کا بنیادی عنصر قرار دیا اور امت مسلمہ کی بقا اور ترقی کے لیے ہر طرف سے ناگزیر سمجھا ان کے مطابق اجتہاد فقہی مسائل میں رائے دینے تک محض محدود نہیں بلکہ یہ ایک مسلسل جاری رہنے والا فکری عمل ہے جو بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی اور سائنسی حالات میں نئی راہیں ہموار کرتا ہے۔

اقبال نے اپنے خطبہ میں ترکی کی لادینیت کے خطرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اقبال نے پیشگی طور پر اس کی اطلاع دی اور ان کے اس خیالِ باطل کی بساط اُلٹ کر رکھ دی تھی۔ اقبال اس بارے واضح طور پر لکھتے ہیں:

> ''پھر اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ تمہارے مذہبی اور سیاسی رہنما حریت اور آزادی کے جوش میں، بشرطیکہ اس پر کوئی روک عاید نہ کی گئی، اصلاح کی جائز حدود سے تجاوز کر جائیں۔''(8)

خطبات اقبال میں اجتہاد کا نظریہ دین اور عقل کے باہمی تعامل کو اجاگر کرتا ہے، جہاں وہ تقلیدی جمود کی مخالفت کرتے ہوئے اجتہاد کو ایک مسلسل متحرک فکری عمل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک اسلامی ریاست کو اجتہاد کے ذریعے بدلتے حالات اور تقاضوں کے مطابق قوانین کو ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کا نقطہ نظر محض ایک دینی مسئلہ نہیں بلکہ فکری تحریک ہے جو اسلامی فکر کی تشکیل نو میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

اقبال ایسے اجتہاد کے بھی سخت مخالف تھے جس میں اجتہاد کو محض اپنے ذاتی مفادات کی حد تک استعمال کیا جائے اور وہ اسلامی روح سے بالکل خالی ہو۔ وہ اجتہاد کے بارے ترکی کی ایسی کوئی پیشرفت کو قبول کرنے کے حق میں بالکل نہ تھے جس سے وہ اسلامی روحانیت سے محروم ہو جائیں۔ اقبال نے ترکی کی اس بے مہار آزادی کو ہدف تنقید بنایا وہ "جاوید نامہ" میں لکھتے ہیں:

مصطفی کواز تجدد می سرود
گفت نقشِ کہنہ رابایدزدود
نو نگردد کعبہ رارخت حیات
گرزافرنگ آیدش لات ومنات
تُرک راآہنگ نودرچنگ نیست
تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست (9)

اقبال اجتہاد کو صرف دائرہ اسلام کی حدود کے اندر پسند کرتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ وہ اجتہاد کو دین اسلام اور شریعت کی حدود کے اندر نئے پیش آنے والے حالات کے مطابق استعمال کریں نہ کہ اس کی حدود سے باہر نکل جائیں۔ اقبال کمال اتاترک کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایدہُ اللہ بنصرہ العز یز" (10)

مگر جب یہی کمال اتاترک کی جدیدیت، دائرہ اسلام کی حدود سے باہر نکلنے لگی اور اسلام اور شریعت کی حدود کو توڑنے لگی تو اقبال نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اقبال کے سامنے اس وقت ترکوں کی فقط قدامت پسندی اور روایت پسندی کے خلاف بغاوت تھی اور انھوں نے اس لیے ان کے اس پہلو کو خراج تحسین پیش کیا۔ اگر اقبال آج ہوتے اور ترکوں کی لادینیت کا مشاہدہ کرتے تو ان کو بھی ہدف تنقید بناتے جیسا کہ انھوں نے مصطفیٰ کمال اتاترک کو بنایا۔

علامہ اقبالؒ کی قانونی فکر میں "اجتہاد" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اجتہاد ایک ایسا ہمیشہ جاری رہنے والا عمل ہے جو اسلامی شریعت کو ہر دور میں پیش ہونے والے تقاضوں سے متفق الرائے رکھتا ہے۔ ان کے مطابق، شریعت کی روح کبھی جامد نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ لچک دار رہتی ہے، جس کی تعبیر ہر دور میں پیش آنے والے نئے حالات کے مطابق کی جانی

چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے اپنے مقالات، شاعری اور خطبات میں اجتہاد کو صرف اجاگر ہی نہیں کیا بلکہ اسے امت مسلمہ کی ارتقاء اور بقا کا واحد راستہ قرار دیا ہے۔ اقبالؒ کا ماننا تھا کہ جب تک اجتہاد کو زندہ رکھا گیا تھا، امت ترقی کرتی رہی، لیکن جب اجتہاد کو چھوڑ دیا گیا تو قوم جمود کا شکار اور زوال پذیر ہونے لگی۔ وہ لکھتے ہیں:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک

دلیل کم نظری، قصۂ جدید و قدیم (11)

اقبالؒ نے اپنے مشہور خطبہ "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں اجتہاد کے ادارہ جاتی پہلو پر بھی بھرپور روشنی ڈالی۔ ان کے نزدیک اجتہاد صرف مفتیوں یا علماء کا ہی نہیں بلکہ پارلیمنٹ جیسے اداروں کا بھی حق ہے، بشرطیکہ وہ قرآن و سنت کے دائرے میں رہ کر کام کریں۔ وہ اجتہاد کو جمہوریت اور قانون سازی کا لازمی جز سمجھتے تھے۔ اقبالؒ نے نئے دور کے چیلنجز کا ذکر کرتے ہوئے اجتہاد کو فکری جرأت کا نام دیا ہے، جس کے بغیر نئی تہذیب سے مقابلہ کسی صورت بھی ممکن نہیں۔

اقبالؒ کے نزدیک اجتہاد کی بنیاد قرآن اور سنت پر ہونی چاہیے، اور اس میں دینی فہم،، بصیرت، تقویٰ اور علمِ عصری لازمی اجزا ہیں۔ وہ اجتہاد کو قومی ترقی کا زینہ اور مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ آج جب عالم اسلام قانون سازی کے میدان میں صرف مغرب کی ہی پیروی کر رہا ہے، اقبالؒ کی فکر ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اسلامی شریعت کو ہر دور میں تازہ رکھنے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے اجتہاد بہت ضروری ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک شریعت اور قانون دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی فکری اور عملی چیز کے دو نام ہیں۔ اقبال شریعت کو صرف فقہی احکام کا مجموعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات تصور کرتے تھے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اقبالؒ قانون سازی کو صرف ایک فرد کی مرضی یا مغرب کی پیروی کے تابع کرنے کے قائل بالکل نہیں تھے بلکہ وہ اسے شریعت، دینی اقدار اور اجتماعی شعور، کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں۔

شریعت اور قانون کی ہم آہنگی کے حوالے سے اقبالؒ کے نزدیک تین بنیادی اصول ہیں:

1. **وحی پر مبنی فکری رہنمائی** :اقبال کی نظر میں جو قانون قرآن و سنت سے محفوظ ہو صرف وہی مستحکم اور قابل قبول ہے قانون سازی کی بنیاد وحی ہونی چاہیے۔

2. **اخلاقیات کا غلبہ** : اسلامی شریعت میں قانون اور اخلاق لازم وملزوم اور ایک دوسرے کا حصہ ہیں جبکہ مغربی قانون میں اخلاقی پہلو انتہائی کمزور ہوتا ہے۔
3. **اجتماعی بھلائی اور عدل** : اقبال چاہتے تھے کہ شریعت کے ذریعے ایسا قانونی نظام قائم کیا جائے جو کمزور اور طاقتور میں فرق نہ کرے بلکہ صرف عدل وانصاف کا علمبردار ہو۔

علامہ اقبال کے نزدیک ملت اسلامیہ کی اصل طاقت کا دارومدار اس کے فکری اور قانونی خود مختاری میں چھپا ہے۔ وہ اس بات کو شدت سے محسوس کیا کرتے تھے کہ جب تک مسلمان اقوام اپنی قانون سازی کو قرآن و سنت کے اصولوں کے مطابق ڈھال نہیں لیتی تب تک وہ نہ تو سیاسی طور پر آزاد ہیں نہ فکری طور پر اور نہ ہی خود مختار بن سکتی ہیں۔ اقبال کی شاعری اور نثر ان کے شعور کی عکاسی کرتی ہے کہ ملت اسلامیہ کو اپنے نظام قانون نظام عدل اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں میں خود کفیل ہونا چاہیے نہ کہ مغربی تقلید کرنی چاہیے بلکہ مغربی تقلید سے نجات حاصل کرنا ہی اصل کامیابی ہے۔

اقبالؒ نے واضح کر دیا کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ مغربی اصولوں کی اندھی تقلید نہ کریں بلکہ اپنی شریعت پر کاربند رہتے ہوئے جدید تقاضوں کے حل کے لیے اجتہاد سے کام لیں۔ اس بارے وہ کہتے ہیں:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی (12)

اقبال کے مطابق خلافت راشدہ ہمارے لیے ایک بہترین عملی نمونہ تھی جس میں قانون سازی قرآن، سنت اور اجتہاد کی روشنی میں ہی کی جاتی تھی۔ اقبال انہی مثالی ماڈل کو جدید اسلامی ریاستوں کی بھی بنیاد بنانا چاہتے تھے تاکہ مسلمان اقوام اپنی خودداری اپنی شناخت اور عدل پر مبنی ایک بہترین نظام قائم کر سکیں۔

اقبال مغربی اُدھار لیے گئے قانونی نظام کو غلامی کی ایک صورت سمجھتے تھے۔ اقبال کا تصور قانون ملت اسلامیہ کی قانونی خود مختیاری کے بغیر کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکتا وہ ایک ایسے نظام کے داعی تھے۔ جو اسلامی قوانین کے تابع ہو اور قومیں اس ان قوانین پر فخر محسوس کرتی ہوں۔ انھوں نے قانون سازی کو اسلامی ریاست کی اساس قرار دیا ان کے نزدیک قانون سازی ایک ایسا عمل ہے جو کہ اللہ کی حاکمیت کے تحت ہونا چاہیے۔ وہ اس بات کے بھی شدید مخالف تھے کہ کوئی ایک انسان یا

قوم اپنے فائدے کے لیے قانون کے خود مختار خالق بن جائیں جیسا کہ مغربی جمہوری نظام میں ہر چیز الگ کر دیا گیا ہے۔ بادشاہت اور سیاست بھی اگر دین سے جُدا ہو تو ظلم و بربریت بن جاتی ہے:

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (13)

اقبالؒ کے مطابق اسلامی ریاست میں قانون سازی کے اصول درج ذیل ہیں:

1. **اللہ کی حاکمیت** : اسلامی قانون سازی انسانی خواہشات یا اکثریت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اللہ کے احکام کی روشنی میں ہوتی ہے۔
2. **قرآن و سنت کی بالادستی** : ہر ایسا نیا قانون قابل قبول ہی نہ ہو جو قرآن سنت کے منافی ہو۔
3. **اجتماعی اجتہاد** : اقبالؒ کے نزدیک اجتہاد کسی ایک فرد کی بجائے اجتماعی عمل کے طور پر ہونا چاہیے، جس میں پارلیمنٹ یا شورائی ادارے اہم کردار ادا کریں۔
4. **عدل و انصاف** : قانون میں محض ظاہری عدل نظر نہ آئے بلکہ اسے عدل و انصاف اور مساوات کا مظہر ہونا چاہیے۔

اقبال کے ہاں اخلاقی تربیت بھی اسلامی ریاست کے قانونی نظام کا ایک خاص پہلو ہے وہ سمجھتے تھے کہ قانون صرف سزا و جزا کا نظام ہی نہ ہو بلکہ ایک ایسا نظام ہونا چاہیے جو افراد کو اخلاقی ارتقاء پر بھی ابھارے اور ان کی ظاہری کے ساتھ باطنی اصلاح بھی کرے۔ ان کے اشعار میں یہی تصور نمایاں ہے:

خرد نے کہہ بھی دیا 'لا الہ' تو کیا حاصل

دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں (14)

اقبالؒ کے مطابق اسلامی ریاست وہی ہے جو قانون سازی کو صرف اللہ کے احکام اور سنت نبویؐ کے تابع کر کے، انسان کو فکری، روحانی، اور معاشرتی اعتبار سے بلند کرے۔ وہ قانون جو ایمان، اخلاق اور تقویٰ سے خالی ہو، تو وہ صرف اور صرف الفاظ کا ہی مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ شعر بھی قانونی نظام کی روحانی بنیاد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

علامہ اقبال نے مغربی تہذیب اور اس کے قانونی نظام پر انتہائی شدید تنقید کی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مغربی قوانین کی بنیاد لادینیت، انفرادی مفاد اور مادیت پر مبنی ہے جبکہ اسلامی قانون ایک اخلاقی، روحانی اور اجتماعی بھلائی پر مبنی نظام ہے اقبال کی شاعری اور نثر مغربی نظام قانون کی خامیوں کو تہہ در تہہ بے نقاب کرتی ہے اور اس کے مقابلے میں ایک مکمل اسلامی متبادل قانون بھی پیش کرتی ہے۔

اقبال کے نزدیک مغربی قانون کا سب سے بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ اس میں انسانی عقل مفاد اور طاقت کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قانونی آزادی مساوات اور انصاف کے خوشنما نعروں کو بلند کرنے کے باوجود بھی مظلوم اقوام پر ظلم اور استحصال کا سبب بنتا ہے اور اس میں "اللہ کی حاکمیت" کا کوئی تصور نہیں، نہ ہی کسی مظلوم کے حق میں یہ قوانین بنائے گئے ہیں۔ اسلام میں دین وسیاست ایک ہی فکری دو دھارے ہیں جبکہ مغرب کے ہاں دین اور سیاست الگ الگ ہے جس نے قانون کو روح سے خالی کر دیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اس بارے لکھا ہے:

> "خطوط میں اقبال کو جس مسئلے سے خاص دلچسپی ہے وہ ماضی وحال کی نئی ترجمانی اور مستقبل کے لیے ایک واضح راستہ تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ اس میں اجتہاد کی اہمیت مسلم ہے"(15)

اقبال کے تنقیدی انداز میں صرف نفی ہی نہیں بلکہ وہ اسلامی شریعت کو متبادل نظام کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کا قانونی نظام درج ذیل نکات پر استوار ہے:

1. **عدل پر مبنی ہے:**۔ اسلامی نظام عدل پر مبنی ہے اس کی نظر میں حکمران ہو یا عام شہری تمام کے مساوی حقوق ہیں اور قانونی حیثیت کے سے وہ صرف ایک فرد ہے۔
2. **وحی پر استوار ہے:** قرآن وسنت قانون سازی کی اساس ہیں۔
3. **اجتماعی فلاح پر مرکوز ہے:** قانون اجتماعی خیر وعدل کا علمبردار ہے نہ کہ صرف شخصی یا انفرادی ازادی کا ضامن ہے۔
4. **اخلاقی وروحانی ہے:** قانون تقویٰ اور خدا ترسی سے بُرے کاموں سے روکتا ہے نہ کہ صرف سزا کے ڈر سے۔

اقبال کے نزدیک مغرب کی فکر میں پارلیمانی نظام کا مقصد صرف اور صرف نمائندگی نہیں بلکہ فقہی اجتہاد، اجتماعی فلاح اور دینی بصیرت پر مبنی قانون سازی تھا۔ اقبال مغربی جمہوریت پر تنقید کرتے ہوئے قانون کو سرمایہ دار اور حکمران طبقے کا

آلہ کار سمجھتے ہیں۔ اقبالؒ نے مغربی جمہوریت پر تنقید کرتے ہوئے اسے سرمایہ دار طبقے کا آلہ کار قرار دیتے ہیں۔ اقبال نے ایسی جمہوریت پر بھی شدید تنقید کی ہے کہ جس میں رائے کی اہمیت و استعداد کا تعین نہیں کیا جاتا:

جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے (16)

اقبال کے نزدیک مغربی پارلیمانی نظام میں عوام کی تعداد کو اہمیت دی جاتی ہے نہ کہ ان کی فکری و اخلاقی صلاحیت یا ان کے حقوق کو۔ اس کے برعکس اقبال ایسا پارلیمانی نظام بنانے کے قائل تھے جس میں منتخب نمائندے علم، تقویٰ اور بصیرت کے حامل ہوں اور قرآن و سنت کی روشنی میں قانون سازی کریں اور فیصلے کریں۔

اقبالؒ کا تجویز کردہ پارلیمانی نظام درج ذیل خصوصیات کا حامل ہے:

1. **اجتماعی اجتہاد کا مرکز** : پارلیمنٹ ایک ایسا ادارہ ہو جو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق قانون سازی کرے اور یہ ادارہ شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے فقہاء علماء ماہرین قانون اور دانشوروں پر مشتمل ہو۔
2. **وحی پر مبنی رہنمائی** :اس قانون میں کوئی بھی شق اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات سے متصادم بالکل نہ ہو بلکہ قرآن و سنت کے مطابق ہو۔
3. **روحانی قیادت کی موجودگی**: دینی فہم، امانت، اور تقویٰ کی بنیاد پر پارلیمانی نمائندے منتخب کیے جائیں بجائے محض سیاسی چالاکی سے۔

اقبال نے اپنے خطبات میں تجویز کیا تھا کہ اجتہاد ہی ہماری اساس ہے اس کے لیے ایک مستقل ادارہ قائم کیا جائے جو جدید پارلیمنٹ کی طرز پر ہو لیکن اس کی بنیاد دینی اصولوں پر مبنی ہو۔ ان کے نزدیک اسلام میں قانون سازی کا عمل شفاف اور اجتماعی ہونا چاہیے اس میں امت کی فکری نمائندگی کے حامل افراد شامل ہوں۔

علامہ اقبال کے قانونی فکر میں عورت کو بھی نہایت اہم اور متوازن مقام حاصل ہے انھوں نے عورت کو اخلاقی، معاشرتی اور دینی لحاظ سے ایک باعزت مقام عطا کرنے کے لیے عورت کے حق میں وکالت کی اور ایسے قانونی نظام کی ضرورت پر بھرپور توجہ دی جو عورت کی آزادی، عزت اور کردار کی حفاظت کرتا ہو۔ اقبال کی شاعری میں عورت محض گھر کی زینت نہیں بلکہ ایک

باشعور، تمدنی اقدار کی امین اور فعال شخصیت کے طور پر ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اقبال کا نظریہ نسواں مغرب کے اس تصور سے بالکل مختلف ہے جو عورت کو صرف مساوات، آزادی اور انفرادیت کے نام پر اخلاقی اور معاشی استحصال کا شکار بناتا ہے۔ انھوں نے عورت کی بدولت زندگی کا سوزِ دُروں بیان کیا ہے:

ع اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں (17)

اقبالؒ کی نظر میں عورت کے لیے قانونی دائرہ کار کچھ بنیادی اصولوں پر قائم ہونا چاہیے:

1. **عزت وعفت کا تحفظ** : عورت کا بنیادی حق ہے کہ ایسا قانون تشکیل دیا جائے جو عورت کو ایسا مقام دے جو اس کی حیا، شرم وعصمت اور نسوانیت کی حفاظت کرے۔
2. **تعلیم وتربیت کا حق**: اقبال عورت کو دینی و دنیاوی تعلیم دینے کے حامی تھے وہ چاہتے تھے کہ عورت کو تعلیم دی جائے تاکہ وہ آئندہ نسلوں کی صحیح تربیت سکے۔
3. **ازدواجی وخاندانی حقوق**: عورت کی وراثت، طلاق، نکاح اور دیگر امور میں قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی ہو جس میں اس کے مقام، اس کے جذبات اور اس کی خواہش کا خیال رکھا جائے۔

اقبال کے نزدیک مغربی طرز پر عورت کے لیے آزادی ایک فریب ہے:

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی (18)

اقبال مغربی حکمرانی اور اس کے بین الاقوامی قانون پر کڑی تنقید کرتے ہیں کیونکہ وہ اقوام عالم کے درمیان عدل اور برابری کے بجائے طاقت، مفاد پرستی اور استحصال کو فروغ دیتا ہے اور غریب کو مظلوم اور سرمایہ دار کو ظالم بنا کر انصاف کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے۔ انھوں نے ایسے قوانین کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ انھوں نے اتحاد، عدل و مساوات اور جارحیت کی روک تھام کے لیے قوانین کی ضرورت پر زور دیا۔ انھیں نکات کو ملاحظہ کیجیے:

1. **امتِ واحدہ کا تصور**: مسلمانوں کے درمیان بین الاقوامی روابط کا دائرہ اسلامی اخوت اور مبنی ہونا چاہیے کیونکہ مسلمان صرف ایک قوم یا ایک ملک نہیں بلکہ عالمگیر امت کا رکن ہے۔

2. **عدل ومساوات** : تمام اقوام کے درمیان برابری، انصاف، اور خود مختاری کا احترام ہو، چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔
3. **جارحیت کی ممانعت** : اسلامی قوانین میں جنگ وامن کے اصول شریعت کی روشنی میں واضح ہیں۔ یہ قانون کسی قوم پر ناحق حملہ یا دباؤ کی اجازت ہر گز نہیں دیتا۔

علامہ اقبال کی فکر ایک وقتی تحریک نہیں بلکہ دورِ حاضر کے لیے بھی رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔ آج کے سیاسی، قانونی اور عالمی پیچیدہ حالات میں اقبال کا قانونی تصور ہمیں ایک متوازن اور ہموار راستہ دکھاتا ہے جس میں اخلاق، عقل، روحانیت اور شریعت ہم آہنگ ہو کر ایک پائدار معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔ اقبال کا پیغام آج کے مسلم معاشروں کے لیے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ آج ہم مغربی قوانین کی تقلید میں اپنی فکری بنیادوں سے دور ہو چکے ہیں اور مزید دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبال کے نزدیک آج جن مسائل کا اسلامی ممالک کو سامنا ہے ان میں قانون سازی کی مغربی بنیادیں، اخلاقی زوال اور عدلیہ کا غیر شرعی کردار ہے۔ ان تمام مسائل کا حل علامہ اقبال اسلامی اصولوں پر مبنی قانون سازی میں دیکھتے ہیں. ان کے مطابق:

1. اجتماعی اجتہاد کو فروغ دیا جائے تاکہ پارلیمنٹ یا شوریٰ کے ذریعے جدید قانونی مسائل کا شرعی حل ممکن ہو۔
2. تعلیم وتربیت کو اسلامی اقدار سے جوڑا جائے تاکہ معاشرے میں قانون کی اخلاقی روح بیدار ہو۔
3. قانون کو روحانیت، عقل اور عدل سے ہم آہنگ کیا جائے تاکہ وہ فرد اور قوم دونوں کی ترقی کا ذریعہ بنے۔

اقبال کے خطبہ اجتہاد کو پون صدی گزر چکی ہے۔ اب دنیا نئے حالات سے گزر رہی ہے اس لیے ہمیں اپنے مسائل کو بھی اجتہاد کے ذریعے نئے حالات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ ہمیں اقبال کے خطبات کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے اور آج عصر حاضر کا سب سے بڑا تقاضا بھی یہ ہے کہ علما اجتہاد کا بند دروازہ دوبارہ کھولنے کی کوشش کریں اسی صورت میں وہ اس فکری خلا کو پُر کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے جو مسلسل حالات کے تقاضوں کے زیر اثر بڑھتا جا رہا ہے جب تک ہم یہ قدم نہیں اٹھائیں گے ہم کولھو کی بیل کی طرح اقبال کے خطبہ اجتہاد ہی کا طواف کرتے رہیں گے۔ اقبالؒ کا قانونی پیغام آج بھی اتنا ہی زندہ وجاوید ہے جتنا انہی کے دور میں تھا۔ مغربی قوانین کی شکست، اخلاقی زوال، اور روحانیت وعدل سے خالی نظام ہمیں اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم اقبالؒ کے افکار کی روشنی میں ایک نئے اسلامی قانونی نظام کی بنیاد رکھیں جو علامہ اقبال کے اس قانونی وژن کا نچوڑ ہونا چاہیے جس میں فرد، قوم اور ریاست سب اللہ کے حضور باوقار اور جواب دہ، ہوں۔

حوالہ جات

1. قادری زور، محی الدین، سید، "شادِ اقبال" (اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد، 1942ء) ص:135
2. ظفر علی خان، مولانا، زمیندار، (لاہور، 9 اکتوبر 1925ء)
3. وحید الدین، سید، فقیر، "روزگار فقیر"، جلد اوّل (جامعہ ہمدرد، دہلی، 1964ء) ص:114
4. Iqbal, Muhammad, The Reconstruction of Religious Thought In Islam, The Principle of Movement in the Structure of Islam, Iqbal Academy Pakistan ء2021), P:132.
5. اعظمی، الطاف احمد، "خطبات اقبال۔ایک مطالعہ" (دارالتذکیر لاہور، ۲۰۰۵ ء) ص:۲۳۸
6. نذیر نیازی، سید (مترجم)، "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ"، طبع دوم (بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۳ء) ص:۲۵۰
7. ایضاً، ص:251-252
8. نذیر نیازی، سید (مترجم)، "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ"، ص:۲۵۲
9. محمد اقبال، "جاوید نامہ"، طبع ہفتم، (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۸ء) ص:۶۶
10. سلیم چشتی، پروفیسر، "شرح جاوید نامہ"، طبع اوّل (عشرت پبلشنگ ہاوس، لاہور، ۱۹۵۶ء) ص:۶۰۱
11. اقبال، محمد، "کلیات اقبال" (اردو) (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2018ء)، ص:538
12. اَیضاً، ص:277
13. اَیضاً، ص:374
14. اَیضاً، ص:661
15. سرور احمد، آل، "اقبال کا نظریہ اصلاح و تجدد"، ماخوذ فکر اسلامی کی تشکیل جدید، (ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ، دہلی 1978ء) ص:366
16. اقبال، محمد، "کلیات اقبال" (اردو)، ص:547
17. اَیضاً، ص:606
18. اَیضاً، ص:397
19. اَیضاً، ص:488